''یعنی؟''

''بھئی جسے ہم بھجواتے ہیں اس کا بھی تو کوئی فرض ہوتا ہے۔ تم نے تو الٹا کام کیا۔ ہم شاعر کو لے گئے۔ تم نے وہاں حبیب جالب سے تقریر کرادی۔ ہمارے سارے پروگرام پر پانی پھر گیا۔''

اور لیجئے اب کیرولین کائزر کا ورود مسعود ہوتا ہے۔ یہ آنا قیامت کا آنا تھا۔ ماشاءاللہ سے دراز قامت' رنگ گورا بھبھوکا' چال جیسے کڑی کمان کا تیر' ہر چند کہ اردو بنگلہ سے نا آشنا تھیں۔ پھر بھی یہ عزم لے کر آئی تھیں کہ پاکستانی ادب پر تحقیق و تدقیق کریں گی۔ سو انہیں حلقہ میں بھی آنا تھا اور ٹی ہاؤس میں بھی صورت دکھانی تھی۔ ہم نے نسخہ وہی استعمال کیا۔ حلقہ میں عزت سے بٹھایا۔ ٹی ہاؤس میں چائے کی میز پر بیٹھ کر ملاقات کی اور کرائی۔ پرانے شہر کی ایک ایک گلی جھنکائی۔ بس اپنا تو اتنا ہی مقدور تھا۔ باقی شہر میں مسافر نواز بہتیرے تھے۔ اور اگر مسافر میم ہو تو مسافر نوازی میں زیادہ خلوص پیدا ہو جاتا ہے۔ خیر ڈیڑھ دن کی میزبانی تو ہم نے بھی کی۔ پال اینگل کی میزبانی تو بس اتنی کی تھی کہ ٹی ہاؤس میں بٹھا کر اسے پکوڑے کھلائے' پھر تانگہ میں بٹھایا اور پرانے شہر کی طرف نکل گئے۔ میں نے بساط بھر اس شاعر کو یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ کل والی سواریوں کے مقابلہ میں اس سواری کی کیا معنویت ہے۔ یہ کہ کس طرح بے حس مشینی سواری کے مقابلہ میں گھوڑا جیسی زندہ مخلوق کی مدد سے چلنے والی سواری میں بیٹھنے سے سارے گرد و پیش سے رشتہ ہی بدل جاتا ہے یا کہہ لیجئے کہ رشتہ زیادہ محسوس اور بامعنی بن جاتا ہے' مگر یہاں ہم اپنی مہمان عزیز کو موٹر میں لے کر پھر رہے تھے۔ پال اینگل کی آمد سے اب تک ہمارے دن بھی تو پھر گئے تھے۔ اب ہم موٹر سوار بن گئے تھے۔ تو لیجئے صاحب ہم کیرولین کائزر کو موٹر میں بٹھا کر شہر کی یاترا پر نکلتے ہیں۔ واضح ہو کہ اس مہم میں ہمارا شریک جوان عزیز اعجاز احمد تھا۔ اسے میں نے پہلی بار ایف سی کالج میں سعید محمود کی معیت میں دیکھا تھا۔ چھریرے بدن گوری رنگت والا سمارٹ نوجوان۔ انگریزی ایم اے کا طالب علم۔ ادب سے خصوصی شغف۔ پھر اسے ٹی ہاؤس پہنچنا تھا۔ ''ادب لطیف'' میں میرے ہوتے ہوئے جوائس کی کہانیوں کے ترجموں سے اس کی ادب میں مہورت ہوئی۔ میں پہلے چکنم میں تھا کہ امریکہ سے آئی ہوئی یہ بی بی نہ اردو جانتی ہے نہ بنگلہ سمجھتی ہے۔ پھر پاکستانی ادب کے بارے میں کیا اور کیسے تحقیق کرے گی' مگر اس سارے دن گھومنے پھرنے کے بعد جب میں نے اعجاز احمد کی آنکھوں میں ایک نئی چمک دیکھی تو سوچا کہ اب یہ تحقیق پروان چڑھ جائے گی اور اعجاز احمد نے جس سفر کا آغاز جوائس کے ترجموں سے کیا تھا اس کے اگلے مراحل اس نے امریکہ میں جا کر طے کیے۔

ہاں لیجئے اب ''ادب لطیف'' سے بھی تو میرا چل چلاؤ تھا۔ روزنامہ مشرق سے وابستہ ہوا تو توجہ بٹ گئی۔ بس پھر تھوڑا ہی عرصہ

ادب لطیف سے نبھا پایا۔

اب سے پہلے تو میں نے اخباروں کے دفتر میں بیٹھ کر اخبار نویسی کی تھی۔ ''مشرق'' کی اخبار نویسی دفتری اوقات سے بے نیاز تھی۔ اس کا تقاضا یہ تھا کہ شہر میں گھومو پھرو' سماجی ثقافتی دنیا کی خاک چھانو' ثقافتی علمی تعلیمی اداروں میں تاکو جھانکو اور کالم لکھو۔ سو وہ زمانہ ختم ہوا کہ دفتر سے نکلے اور سیدھے ٹی ہاؤس۔ اب ملا کی دوڑ خالی مسجد تک نہیں تھیں۔ مسجد ہو' مدرسہ ہو' کوئی خانقاہ ہو' میکدہ ہو' تاڑی خانہ ہو' ناچ رنگ کی کوئی محفل ہو' ٹک دیکھ لیا' دل شاد کیا اور خامہ فرسا ہو گئے۔ ویسے وہ زمانہ بھی امی جمی کا تھا۔ وہ دن بہت پیچھے رہ گئے تھے جب لٹے پٹے قافلے لگاتار آ رہے تھے اور سر چھپانے کی جگہ ٹٹولتے پھرتے تھے۔ بحالیاتی دفتروں کے سامنے بھی اب وہ بھیڑ بھڑ کا نظر نہیں آتا تھا۔ حکومتوں کے تابڑ توڑ بننے ٹوٹنے کا دور بھی گزر گیا تھا۔ اس افراتفری میں ایک جرنیل نے آ کر سب کو ٹھکانے لگا دیا۔ آزادی خیال ضبط' انڈا مرغی سستا' اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ ایک دفعہ تو ایوب خان زندہ باد کا نعرہ لگ ہی گیا۔ یہ زمانہ دورنگا تھا۔ قومی زندگی تنزلی کا شکار تھی۔ مگر معاشی اعتبار سے ترقی کے اثر آثار تھے۔ آخر مال روڈ خواہ مخواہ تو چوڑی نہیں ہوئی تھی اور نئی سواریوں کا وفور بلاوجہ تو نہیں تھا اور جب میں حلقہ میں روتا گاتا تھا کہ بلند و بالا درخت شہید کیے جا رہے ہیں تو ترقی پسند دوست کہتے تھے کہ یہ تو صنعتی ترقی کا لازمہ ہے اور ایوب خاں نے بجا سوچا کہ اتنا کچھ چھینا ہے تو کچھ دینا بھی چاہیے۔ سو سیاسی جلسے جلوس کی رونق گئی تو ثقافتی میلوں ٹھیلوں کو بڑھاوا دیا گیا۔

ادب میں بھی میلوں ٹھیلوں کا دور شروع تھا۔ رائٹرز گلڈ اپنے ساتھ کتنی برکتیں لے کر آیا۔ سیل سپاٹے' درون ملک اور بیرون ملک کے دورے' کتابوں پر انعامات' معذور ادیبوں کے لیے وظیفے' کچھ معذور تھے کچھ اس ریلے میں معذور بن گئے۔ جسمانی معذوری اپنی جگہ' ذہنی معذوری اپنی جگہ' گلڈ کے الیکشن اپنی جگہ۔ غزل' افسانہ موقوف' اس زمانے میں بس رقعے لکھے جاتے تھے۔ ندرت بیان بس انہوں رقعوں میں نظر آتی تھی۔ مجھے جو رقعے موصول ہوئے ان میں سے چند ایک کاغذوں سے برآمد ہو گئے ہیں۔ مشتے نمونہ از خروارے۔

''کیا میں آپ کے ووٹ' تعاون اور مژدہ جانفزا کی امید رکھوں۔''

''اب میں نے فیصلہ کیا ہے کہ ان لوگوں کی خدمت کی جائے جن کے دم سے زبان و ادب کا چمن شگفتہ ہے۔ اس مقصد کے لیے میں رائٹرز گلڈ کی علاقائی مجلس عاملہ کی رکنیت کا انتخاب لڑ رہا ہوں۔ فقط.....

پھیلی ہے اب کے گلڈ میں ایسی وبائے ووٹ

سارے امیدوار ہیں سب مبتلائے ووٹ
حالت کبھی نہ اہل قلم کی سدھر سکی
پہلے گدائے رزق تھے اب ہیں گدائے ووٹ

فقط امیدوار کرم..... گدائے ووٹ

''یہ ایسی فرمائش ہے کہ آپ کے پچاس فی صد ووٹرانہ حقوق میں حاصل کر رہا ہوں' لیکن دنیا میں مجبوری بھی کوئی چیز ہے۔''

فقط.....

''صوبائی ریجن کی عاملہ کے لیے مجھے بھی انتخاب میں دھکیلا گیا ہے۔ بھائی یہ انتخاب آپ ہی کو لڑنا ہے۔''

آپ کا.....

''آپ کو تو علم ہی ہے کہ پشاور سے بندہ بھی گلڈ کی عروس رکنیت کا امیدوار ہے۔ براہ کرم ایک ووٹ میرے حق میں بھی استعمال کیجئے گا۔''

نیازمند.....

گلڈ کی جدوجہد کا ایک پہلو یہ تھا کہ ادیبوں کو معاشرے میں ایک باعزت مقام حاصل ہونا چاہیے اور تصور یہ قائم کیا کہ اگر سرکٹ ہاؤس میں سی ایس پی افسروں کے ساتھ ساتھ ادیب بھی مہمان ہونے کا استحقاق حاصل کر لیں تو سمجھ لو کہ انہیں معاشرے میں باعزت مقام حاصل ہو گیا۔ سو جب ایک مرتبہ گلڈ کے کسی اجلاس میں شرکت کے لیے جانے والا ادبی وفد سرکٹ ہاؤس میں جا ٹھہرا تو جمیل الدین عالی نے اطمینان کا سانس لیا اور خدا کا شکر ادا کیا کہ ان کی مساعی جمیلہ کامیابی سے ہمکنار ہوئیں اور پاکستانی ادیبوں کو معاشرے میں ایک باعزت مقام حاصل ہو گیا۔

ادھر میں کنوئیں کا مینڈک۔ اب شہر گردی کو شعار کیا تھا۔ ثقافتی اداروں محفلوں میں تاکتا جھانکتا پھرتا تھا۔ اس شہر میں ثقافتی ادارے ایسے کون سے بہت سے تھے۔ لے دے کے ایک آرٹ کونسل' فنون کے ذیل میں جو کچھ ہوتا تھا یہیں ہوتا تھا۔ یہ آرٹ کونسل کیا خوب تھی۔ وسیع و عریض سبزہ زار۔ اس کے بیچ جا بجا کھڑے ہوئے چیڑ کے بلند و بالا درخت تھے۔ ان سے پرے ایک مختصر سی عمارت۔ کمروں کے بیچ ایک مختصر سا آڈیٹوریم۔ اس میں کھیل ہوتے تھے۔ اگر ہال کی ساری نشستیں پر ہو جاتیں تو سمجھا جاتا کہ کھیل

سپر ہٹ ہوگیا۔ ان دنوں یہاں تھیٹر کی سرگرمی تیز تھی۔ میرے بھی ایک کھیل کے دن پھر گئے۔ بھلے دنوں میں یاروں کی ایک منڈلی کہہ لیجئے کہ اظہار کاظمی اور حمید علوی کی فرمائش پر لکھا تھا۔ کھیل مکمل ہوتے ہوتے وہ منڈلی ہی بکھر گئی۔ کھیل دھرا کا دھرا رہ گیا۔ اب کمال احمد رضوی نے مجھ سے اچکا اور اسے ''خوابوں کے مسافر'' کے نام سے سٹیج کر ڈالا۔ اسے اس کی ہدایت کاری کا کمال کہنا چاہیے کہ کھیل ہٹ ہوگیا۔ مجھے گمان ہوا کہ میں سچ مچ ڈرامہ نگار ہوں۔ اسی رو کو ایک سٹیج پلے اور لکھ ڈالا۔

انہی دنوں بانو قدسیہ نے تابڑ توڑ کئی سٹیج پلے لکھے۔ کمال احمد رضوی نے انہیں سٹیج کیا۔ بہت کامیاب گئے۔ پھر کوئی کھیل اشفاق احمد کا' کوئی کھیل اصغر بٹ کا' ہاں ایک کھیل جو بہت کامیاب گیا وہ تھا عتیق اللہ شیخ کا ''ایک لڑکی شرمیلی سی''

لگتا تھا کہ لاہور کا سٹیج مستعار کھیلوں کے مرحلہ سے گزر کر طبعزاد کھیلوں کے مرحلہ میں داخل ہوگیا ہے اور اب تھیٹر کے پھلنے پھولنے کا وقت آ گیا ہے۔ تھیٹر کے رسیاؤں کو اس وقت کیا پتا تھ کہ جب یہاں نئی عمارت کھڑی ہوجائے گی اور شاندار آڈیٹوریم بن جائیں گے تو کیا گل کھلے گا اور سٹیج کن ہاتھوں میں چلا جائے گا۔

اچھا لیجئے' لاہور میں ایک نیا ادارہ قائم ہونے لگا ہے اور یہ لاہور تک نہیں رہے گا۔ اس کی کل پاکستان حیثیت ہوگی۔ مغربی پاکستان سے لے کر مشرقی پاکستان تک کتنے شہروں میں اس کی شاخیں ہوں گی۔ مقصود ہوگا قومی یکجہتی۔ نام ہوگا پاکستان کونسل برائے قومی یکجہتی۔

پاکستان کونسل کا افتتاح جسٹس کارنیلیس کے ہاتھوں ہوا۔ فرخ نگار عزیز اس کی ڈائریکٹر بنیں۔ افتتاح کے بعد جو اس کا پہلا جلسہ ہوا وہ ادبی نوعیت کا تھا۔ یعنی پاکستان کونسل نے بسم اللہ ادب سے کی۔ بارش کا پہلا قطرہ یوسف ظفر بنے۔ وہ ایک مقالہ لکھ کر لائے تھے ''ہمارے ادب کے سرچشمے'' اے لو یہ تو وہی بحث شروع ہوگئی جس پر ہم پچھلے کم وبیش دس سال سے حلقہ میں اور حلقہ سے باہر سر پھٹول کر رہے تھے کہ ہماری تاریخ اور ثقافت کہاں سے شروع ہوتی ہے۔ موہنجوداڑو سے یا مسلمانوں کی آمد کے وقت سے اور یوسف ظفر نے کمال دکھایا۔ پہلے یہ کہا کہ اردو ادب کی روایت کی تشکیل عرب وعجم کی روایت اور قرآن حکیم کی حکایات کے اثر میں ہوئی ہے اور افسوس کیا کہ اقبال کے بعد سے لکھنے والے اس روایت کو بھولتے جا رہے ہیں۔ پھر انہوں نے ایک زقند لگائی اور اس کے الٹ ایک افسوس کیا' کہا کہ ادب کی جڑیں زمین میں ہونی چاہئیں۔ پاکستان کے لکھنے والوں کی تحریروں میں پاکستان کے دریا اور پہاڑ کیوں نظر نہیں آتے۔

سجاد باقر رضوی نے دہائی دی کہ آپ نے تو اردو ادب کی روایت سے زمین ہی کو خارج کر دیا۔ پھر اس میں زمین کیوں تلاش کر

رہے ہیں۔

ایک زندہ دل کو ادرک کی مثال کی سوجھی۔ کہا کہ کنجڑے کی دکان پر ادرک کی وہ گانٹھیں سجی ہوئی کتنی اچھی لگتی ہیں جن پر تھوڑی تھوڑی مٹی لگی ہو۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ ادرک تازہ ہے اور ابھی کھیت سے آیا ہے۔ افسوس کہ پاکستان کا ادب ادرک کی سوکھی گانٹھ بن کر رہ گیا ہے۔ وہ ادب اور وہ ادرک کہاں ہے جس پر تھوڑی تھوڑی پاکستان کی مٹی لگی ہو۔

یہ دسمبر 1964ء کا ذکر ہے۔ مگر اس کے بعد پاکستان کونسل کو جلدی ہی احساس ہو گیا کہ اگر اس نے یہی روش قائم رکھی تو وہ دوسرا حلقہ ارباب ذوق بن کر رہ جائے گا۔ سو جلدی ہی محفل کا رنگ بدلا۔ بہر حال اس کا ایک فائدہ تو ہوا کہ اب وقتاً فوقتاً ہمیں بنگالی صورت بھی دیکھنے کو مل جاتی تھی۔ مشرقی پاکستان سے کبھی کوئی مصور، کبھی کوئی مغنی، کبھی کوئی ادیب، کوئی دانشور وارد ہوتا اور اسے دیکھ کر ہم سمجھ لیتے کہ قومی یکجہتی پروان چڑھ رہی ہے۔

بس ثقافت کی حد تک اس شہر کا اتنا ہی مقدور تھا۔ رہا باہر کی ثقافتی دنیا سے رابطہ تو وہ بس چین کی حد تک تھا اور عجب ہے کہ تب سے اب تک چین ہی کی حد تک ہے۔ بس یہی کہ ادھر سے کوئی ثقافتی طائفہ یہاں آن وارد ہوا۔ یہاں سے کوئی ثقافتی طائفہ ادھر چلا گیا۔ چار ادیب ادھر سے آئے اور ہمیں صورت دکھا گئے۔ یہاں سے ادیبوں کی کوئی ٹولی اٹھی اور علم کی تلاش کے نام پر چین جا پہنچی۔ خیر چین کوئی ایسا ویسا ملک تو نہیں ہے۔ ایک قدیم تہذیب کا وارث ہے، مگر ہمارا تو جتنا بھی رابطہ ہوا انقلابی چین کی ثقافت سے ہوا اور یہ ہم آپ جانتے ہی ہیں کہ انقلاب لانے والے ادب اور ثقافت کو کیا سے کیا بنا دیتے ہیں۔

ہاں حیات احمد خاں کی پاکستان موسیقی کانفرنس نے یہ طور اپنایا تھا کہ موسیقی کا سالانہ جشن دھوم سے منایا جاتا اور اس کے لیے کلاسیکی موسیقی کے دو ڈھائی نگ ہندوستان سے بھی منگا لیے جاتے، مگر یہ سلسلہ بھی 1965ء میں جا کر ختم ہو گیا۔ مگر ٹھہریے 1965ء اب شروع تو ہونے لگا ہے، لیکن یہ جو امی جمی کے گنے چنے دن ہیں میں انہیں تو نبٹا دوں۔

اسی 1964ء کے بیچ ادب اور کلچر کے نام پر ایک اور شگوفہ بھی تو اس شہر میں پھوٹا تھا۔ کراچی میں ادب کے نام پر جو گل کھلا تھا اس کی خوشبو تو اب خیر سے ملک میں پھیل چکی تھی اور پشاور سے لے کر ڈھاکہ تک سارے ادیب متحرک تھے۔ حرکت میں برکت ہے۔ ادیب پہلی مرتبہ اس ملک میں حرکت میں آئے تھے۔ راوی ان کے لیے برکت لکھتا ہے، مگر جواب میں لاہور کو بھی تو کوئی گل کھلانا تھا۔ واضح ہو کہ کہنے والوں نے ان دنوں ایک اعلان یہ کیا تھا کہ ایوب خان پاکستان کے جنرل ڈیگال ہیں۔ تو پھر ان کا آندرے مالرو کسی کو ہونا تھا۔ شروع کے برسوں میں قدرت اللہ شہاب صاحب بھی بہت زوروں میں تھے۔ ساتھ میں گلڈ بھی زوروں میں تھا، مگر

اب ہوا کسی قدر بدل گئی تھی۔ اب کراچی بھی پیچھے رہ گیا تھا اور شہاب صاحب بھی تھوڑا پیچھے کھسک گئے تھے۔ اب ملک کا صدر مقام اسلام آباد تھا اور آندرے مالرو والا مقام الطاف گوہر صاحب نے حاصل کر لیا تھا۔ وہ اس وقت سیکرٹری اطلاعات تھے۔ خیر سیکرٹری اطلاعات تو آتے جاتے رہتے ہی ہیں مگر الطاف گوہر جس دھوم کے سیکرٹری اطلاعات گزرے ہیں ویسی دھوم کا سیکرٹری اطلاعات ہم نے تو پھر دیکھا نہیں۔ تجمل حسین ان کے بھائی اور یاروں کے یار' خیر یار تو وہ ایک وقت میں جمیل الدین عالی کے بھی تھے' مگر کنونشن کے ہنگام انہوں نے اپنا زور دکھایا اور اس شان سے دکھایا کہ جمیل الدین عالی پہلے برہم ہوئے' پھر ان کی آواز بھرائی' پھر وہ سٹیج پر تقریر کرتے کرتے بے ہوش ہو گئے۔

اب تجمل حسین لاہور میں آ کر براجے تھے۔ یہاں وہ انکم ٹیکس کمشنر بن کر وارد ہوئے تھے' مگر وارد ہوتے ہی ادب اور ثقافت کی سطح پر بھی متحرک ہو گئے۔ اب میں یاد کرنے کی کوشش کر رہا ہوں کہ وہ اس شہر میں آ کر کس طرح شروع ہوئے تھے۔ اے لو اس زمانے کا لکھا ہوا ایک کالم یعنی وہ جو لاہور نامہ کے عنوان سے میں لکھا کرتا تھا کاغذوں میں سے برآمد ہو گیا ہے۔ میں اسے پڑھنا شروع کرتا ہوں اور یاد کرتا ہوں کہ ہوا کیا تھا۔ یہ 14 جون 1964ء کا کالم ہے۔

''چند دانشور خاموشی سے جمع ہوئے۔ مرنجاں مرنج طریق پر سوچ بچار کیا۔ ایک نے تجویز پیش کی' دوسرے نے تائید کی۔ یوں ادارہ بھی بن گیا اور کمیٹیاں بھی قائم ہو گئیں' مگر جب یہ سوال آیا کہ ادارے کا نام کیا ہو تو لڑائی شروع ہو گئی۔

''نام پر لڑائی ہمارے یہاں نئی بات نہیں' ہمارے معاشرے میں بعض گھرانوں کی ہیت ترکیبی کچھ اس قسم کی ہوتی ہے کہ خالہ جان سنی ہیں تو پھوپھی اماں شیعہ ہیں۔ ایسے گھرانے میں بچہ پیدا ہو تو یوں ڈھولک بھی بجتی ہے اور مبارک سلامت کا شور بھی ہوتا ہے۔ مگر جہاں یہ سوال آیا کہ بچہ کا نام کیا ہو تو گھر پانی پت کا میدان بن جاتا ہے۔ پھر زچہ و بچہ بیک گراؤنڈ میں چلے جاتے ہیں اور نظریات و عقائد آپس میں ٹکراتے ہیں۔

''اعجاز حسین بٹالوی اس روایت کا شاندار تجربہ رکھتے ہیں' اس لیے وہ شعور سے لڑے۔ مگر اے ڈی اظہر صاحب اور ڈاکٹر باقر اندھا دھند ایک دوسرے سے ٹکرائے اور لہولہان ہو گئے۔

''اس جلسہ میں کچھ جانے پہچانے ادیب موجود تھے' کچھ جانے پہچانے ادیب موجود نہیں تھے۔ اور کچھ کو جنہیں ادیب کی حیثیت سے پہچانا نہ جا سکا' انہیں ہم نے دانشوروں میں شمار کیا۔ صدارت کی کرسی پر صوفی تبسم بیٹھے تھے اور جلسہ کی روح رواں تجمل حسین صاحب تھے' جنہوں نے شہر میں داخل ہوتے ہی اپنے وجود کا ثبوت دے دیا تھا۔ جب اوپن ائیر تھیٹر میں مشاعرہ ہوا تو اسی

وقت ہمارا ماتھا ٹھنکا تھا کہ یہ تو محض ابتدا ہے۔

''تجمل حسین صاحب کی یہ تجویز تھی کہ لاہور میں افریشیائی پیمانے پر ایک تہذیبی تقریب منعقد کی جائے۔ اس کے ذیل میں ملک ملک سے ادیب آئیں۔ ادبی اجتماعات ہوں۔ مصوری کی نمائش سجے۔ ڈرامے کھیلے جائیں۔

''سب نے سنا اور اتفاق کیا اور میں حیران تھا کہ یا اللہ اتنے گنو لوگ یہاں جمع ہیں کہ کسی مسئلہ پر سرے سے اختلاف ہی پیدا نہیں ہوتا۔ تب تجمل صاحب نے اطمینان کا سانس لیا اور بولے اس ادارے کا نام بھی رکھ لیں۔ میں نے اس کا نام ''تھنکر زفورم'' سوچا ہے۔ ''تھنکر زفورم؟'' اے ڈی اظہر صاحب نے فوراً ایک پھریری لی۔ اے ڈی اظہر صاحب بہت سادہ نکلے۔ انہوں نے قومی زبان میں نام رکھنے کے حق میں اس اعتماد سے تقریر کی جیسے سب ان کے قائل ہو جائیں گے۔ ڈاکٹر باقر کی قوت کا انہیں آخر وقت تک اندازہ نہیں ہوا۔

''شہر میں پہلے اونٹ بدنام ہوتا تھا' اب بنگالی بدنام ہیں۔ اردو کی جہاں کسی نے بات کی' یاروں نے منہ پر انگلی رکھ کر اشارہ کیا ''بنگالی خفا ہو جائیں گے' یہ تمام فیصلے ہو گئے اور کسی نے نہیں کہا کہ آپ کل پاکستانی بنیادوں پر جب ایک قصہ شروع کر رہے ہیں تو کسی بنگالی کو بھی مشورے میں شامل کر لیں مگر اب اردو میں نام رکھنے کا سوال آیا تو مختلف حضرات کو بنگالیوں کی یاد آئی۔

''اس کے علاوہ بھی چند دلچسپ دلائل پیش ہوئے۔ ایک دلچسپ دلیل اعجاز حسین بٹالوی نے دی۔ ان کی دلیل یہ تھی کہ اگر پاکستان کے اندر کا معاملہ ہوتا تو اس کا نام اردو میں رکھنا مناسب تھا۔ مگر چونکہ اس ادارے کو بین الاقوامی سطح پر سرگرم ہونا چاہیے' اس لیے اس کا نام انگریزی میں ہونا چاہیے۔ واضح رہے کہ اعجاز حسین بٹالوی پچھلے بارہ سال سے بین الاقوامی سطح پر سرگرم ہیں اور ان کا ایک قدم لندن میں اور ایک قدم نیویارک میں ہوتا ہے۔ مگر ابھی تک انہوں نے اپنا کوئی انگریزی نام نہیں رکھا ہے۔ بحث کے دوران اے ڈی اظہر صاحب کو طیش آیا اور انہوں نے اعلان کیا کہ ہم نے اپنی مادری زبان اردو لکھوائی تھی اس کا خضر تمیمی صاحب نے خوب جواب دیا کہ وہ تو پاکستان سے پہلے لکھوائی تھی۔

''احمد ندیم قاسمی نے چین کی مثال پیش کی اور بتایا کہ وہاں قومی زبان میں اداروں کا نام رکھتے ہیں' مگر ایک نام انگریزی میں بھی رکھ لیتے ہیں۔ ویسے اس بحث میں یہ منزل کئی بار آئی کہ تجمل حسین نے کہا کہ اچھا نام انگریزی میں اور دوسرا نام اردو میں۔ اے ڈی اظہر صاحب کو اصرار ہوا کہ پہلا نام اردو میں اور دوسرا نام انگریزی میں۔ جب وہ ذرا چپ ہوئے اور تجمل حسین نے موقع غنیمت جان کر جھٹ پٹ اس فیصلہ کو قلم بند کرنا چاہا تو صوفی صاحب نے ٹوکا کہ ٹھہریئے کیا یہ فیصلہ ہو گیا ہے۔ پس کرسی صدارت کے ایما پر یہ

تنازعہ دوبارہ شروع ہوا اور طول کھنچتا چلا گیا۔ کسی نے کہا کہ اچھا اردو کو چھوڑو فارسی میں نام رکھتے ہیں۔ مگر ڈاکٹر باقر کو فارسی میں سے اردو کی خوشبو آنے لگی۔ پھر کسی نے کہا کہ اچھا عربی میں نام رکھ لیتے ہیں۔ یہ نام اے ڈی اظہر صاحب کو نامانوس نظر آیا۔

''تو نہ یار لوگ عربی پر متفق ہوئے نہ فارسی پر نہ اردو پر اتفاق انگریزی پر ہی ہوا۔ بس اے ڈی اظہر اور عجائب گھر والے شمس لیجیو وڈیو کرتے رہ گئے۔ اتفاق ہم ہر پھر کر انگریزی ہی پر کرتے ہیں۔

''اس بحث میں سب سے کام کی بات جمیلہ ہاشمی نے کہی۔ انہوں نے گردن سے بہت سارا پسینہ پونچھا اور بولیں ہائے اللہ خود تو پنکھے کے سامنے بیٹھے ہیں اور ہمیں گرمی میں بھون ڈالا۔''

تو لیجیے تھنکر زفورم منصہ شہود پر آ گیا۔ رائٹرز گلڈ تو ملک گیر سطح پر متحرک ہوا تھا تھنکر زفورم اونچا اڑا۔ پہلی ہی اڑان میں افریشیائی بلندیوں کی خبر لایا۔ افریشیائی جشن کی تیاریاں کس شان سے ہوئیں۔ اتفاق سے اس تقریب سے بھی لکھا ہوا ایک لاہور نامہ مجھے مل گیا ہے۔ یہ 31 جنوری 1965ء کا لکھا ہوا ہے۔ اچھا ذرا پڑھ کر دیکھتا ہوں کہ اس وقت ہوا کیا تھا۔

''تھنکر زفورم میں جس افریشیائی جشن کا وعدہ کیا تھا وہ سچ مچ منعقد ہو رہا ہے۔ اب اس جشن کو ہوا سمجھو کہ فورم کے سیکرٹری جنرل تجمل حسین صاحب پاکستان کونسل میں آ کر اس جشن کی تفصیل بھی بتا گئے اور تیاریوں کی خبر بھی دے گئے۔

''تیاریوں میں ایک تیاری تو یہی ہے کہ مہمان ادیب ٹھہریں گے کہاں اور کھائیں گے کیا؟ یہ تیاری بہت اہم ہے۔ کیونکہ ہمیں یہ بات یاد ہے کہ یہ تیاری نہ ہونے کی وجہ سے پاکستان میں ژاں پال سارتر کی آمد ملتوی ہو گئی تھی۔ ہوا یوں کہ پاکستان رائٹرز گلڈ نے ایک برس یہ اعلان کیا کہ ہم اپنے سالانہ اجلاس میں ایزرا پاؤنڈ اور ژاں پال سارتر کو بلائیں گے۔

''یہ اعلان ہونے کے بعد جب گلڈ کی انتظامیہ کمیٹی کا جلسہ ہوا تو یورپ میں گھومے پھرے ایک ادیب نے یہ سوال اٹھایا کہ آپ ان بزرگوں کو ٹھہرائیں گے کہاں؟

''یہ سوال بہت پریشان کن ثابت ہوا۔ تب منیر نیازی نے کہا کہ ''سارتر کو تو میں اپنے ہاں ٹھہرا لوں گا۔''

''یعنی کہاں؟'' کسی نے سوال کیا۔

''اس پر شاعر نے کہا کہ میں نے اچھرہ موڑ پر ایک کمرہ کرائے پر لیا ہے۔ ایک چارپائی تو ہے ایک چارپائی کا انتظام اور کر لوں گا۔ سارتر بھی ادیب ہے، میں بھی ادیب ہوں، زیادہ تکلف کی ضرورت نہیں، ہم دونوں مزے سے رہیں گے۔

''شاعر کی اس پیشکش پر اعجاز حسین بٹالوی نے تیوری پر بہت بل ڈالے اور کہا کہ ''دیکھئے منیر نیازی صاحب بات یہ ہے کہ

یورپین ادیب رہائش کے معاملے میں باتھ روم کو بہت اہمیت دیتے ہیں' آپ کا باتھ روم کیسا ہے۔ اس سوال نے منیر نیازی کو بہت گڑبڑایا۔ اعجاز حسین بٹالوی بھی اس مسئلہ کا مناسب حل پیش نہ کر سکے اور یورپین ادیبوں کی آمد کا معاملہ کھٹائی میں پڑ گیا۔

''اعجاز حسین بٹالوی تھنکر زفورم کی انتظامی کمیٹی میں شامل ہیں اور اس کمیٹی نے رہائش کے مسئلہ پر مناسب توجہ دی ہے۔ جشن کے دنوں میں پورا پارک لگژری ہوٹل فورم کے تصرف میں ہوگا پھر بہت سے کمرے نوزائیدہ انٹرنیشنل ہوٹل کے اور کچھ کمرے ایمبیسیڈر کے اس کے پاس ہوں گے۔

''کھانے کی تفصیلات بہت ہیں۔ ایک تفصیل یہ ہے کہ پرانے شہر کی ایک حویلی میں ایک دسترخوان بچھے گا اور افریشیائی ادیب پاکستانی کھانے تناول کریں گے۔

''یہ تفصیل جان کر ہمیں وہ خاتون افسانہ نگار یاد آئیں جنہوں نے شہزادہ تھائی لینڈ کی دعوت میں بیٹھے بیٹھے یہ کہا تھا کہ غیر ملکی مہمانوں کو ہم یورپین طرز پر کھانا کیوں کھلاتے ہیں۔ کیوں نہیں ہم دسترخوان بچھاتے اور انہیں دیسی کھانے کھلاتے ہیں' مگر پھر ہم نے ''مشرق'' میں نعیم طاہر صاحب کا ایک خط پڑھا اور یہ پڑھ کر حیران ہوئے کہ نعیم طاہر صاحب تو غیر ملکی مہمانوں کی ہم راہی میں ان کے گھر بہت دعوتیں کھا چکے ہیں اور یہ سب دعوتیں ڈائننگ ٹیبل پر چھری کانٹے کے ساتھ ہوئی تھیں بلکہ غیر ملکی مہمان نہ ہوتے تو بھی چھری کانٹوں کا استعمال بڑے اہتمام سے کیا جاتا تھا۔

''خیر یہ کھانے والے جانیں اور کھلانے والے جانیں ہمیں کیا۔ اور پھر یہ کہ ادیب کے قول و فعل میں ہم آہنگی کوئی ایسی لازم بھی نہیں۔ بہر حال تھنکر زفورم ایک دسترخوان پرانے شہر کی ایک حویلی میں بچھائے گا اور افسانہ نگار موصوف کو جو دیسی کھانے پسند ہیں وہ سب وہاں موجود ہوں گے۔ ویسے ہمارا یہ پوچھنے کو جی چاہتا ہے کہ اس دسترخوان پر کیا بھارت کے ادیب بھی موجود ہوں گے اور کیا انہیں الگ بھوجن پروسا جائے گا۔ کہتے ہیں کہ چینی بھی کھانے کے معاملہ میں سخت متعصب واقع ہوئے ہیں۔ خیر ایک دسترخوان پر افریشیائی حضرات کو بٹھا کر دیکھ لیجئے پھر کھلے گا کہ افریقہ اور ایشیا میں تہذیبی یگانگت کتنی ہے۔

''یہ لوگ ڈائننگ ٹیبل پر چھری کانٹے کے ساتھ متحد ہو سکتے ہیں۔ دسترخوان کو درمیان میں لائیں گے تو پھر سب یاروں کا اپنا اپنا دسترخوان ہوگا اور اپنے اپنے کھانے۔

''ویسے کچھ ایسے تہذیبی مشاغل بھی ہیں جو اس جشن کے پروگرام میں شامل نہیں۔ مگر جن پر کسی ایشیائی یا افریقی ادیب کو اعتراض نہیں ہو سکتا۔ ڈرامہ بھی جائز اور محفل موسیقی اور مشاعرہ بھی جائز' مگر کیا مضائقہ تھا کہ پتنگ بازی اور کبوتر بازی ایسے ثقافتی مشاغل کو

بھی پروگرام میں شامل کرلیا جاتا۔ پتنگ پاکستان اور بھارت میں تو خیر اڑتی ہی ہے چین سے بھی اس فن عزیز کا بڑا گہرا تعلق ہے۔

''تجمل حسین صاحب نے بتایا کہ اس تقریب کے ذیل میں کچھ عام اجلاس ہوں گے اور کچھ نشستیں ایسی ہوں گی جن کے دروازے پبلک اور پریس پر وا نہیں ہوں گے۔

اس پر عبداللہ ملک کو بہت طیش آیا۔ اور انہوں نے بہت سوال کیے۔ مگر تجمل حسین کا استدلال یہ تھا کہ بین الاقوامی اجتماعات میں مختلف نشستوں کے بارے میں اس قسم کی احتیاط کا دستور چلا آ رہا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ادیب بعض اوقات ایسی باتیں کر جاتے ہیں جو ان کے ملک کی خارجہ پالیسی سے ہم آہنگ نہیں ہوتیں۔ اور اس لیے اگر یہ کاروائی پریس میں آئے تو اس سے سیاسی الجھن پیدا ہوتی ہے۔ اصل میں جب ادیبوں کے بین الاقوامی اجتماعات کا رواج بڑھا تب انہیں پتا چلا کہ وہ اتنے آزاد نہیں ہیں جتنا آپ کو وہ سمجھتے چلے آئے ہیں۔ بیسویں صدی کا ادیب چلا تھا اس مقام سے کہ وہ اللہ میاں سے گلوخلاصی حاصل کرے گا اور پہنچا اس مقام پر کہ جو ادیب جس ملک کا ہے وہ اس ملک کی خارجہ پالیسی کا پابند ہے۔''

ویسے تو میں نے اس جشن کی ساری تفصیلات ہی اپنے کالموں میں قلمبند کی تھیں' مگر ڈھونڈ ڈھونڈ کے تھک گیا۔ ان میں سے کوئی کالم دستیاب نہیں ہوا۔ مجھے بس اتنا یاد ہے کہ دسترخوان واقعی ویسا ہی بچھا تھا جیسا وعدہ کیا گیا تھا۔ افریشیائی مہمانوں کے طفیل میں نے بھی اس دسترخوان پر مزے مزے کے کھانے کھائے تھے۔ میں ان میں سے نہیں ہوں کہ کھا کر بھول جاؤں۔ میں نے تھنکر زفورم کا نمک کھایا ہے۔ ہاں ان اجلاسوں کی بس دو باتیں مجھے یاد آ رہی ہیں۔ ایک تو قراردادوں والے سیشن میں فیض صاحب بہت سرگرم تھے۔ مختلف افریشیائی مندوبین کو مناتے پھر رہے تھے کہ کسی متنازع فیہ سیاسی مسئلہ پر قرارداد پیش کرنے پر اصرار مت کرو۔ دوسری بات مجھے یہ یاد ہے کہ اختتامی اجلاس میں ملک راج آنند نے بہت زوردار تقریر کی تھی۔

جب اجلاس ختم ہوا تو میں نے ابن انشا سے مل کر ایک سازش کی۔ میں نے کہا کہ یار' یہ اتوار کی شام ہے۔ حلقہ کا جلسہ اب شروع ہونے کو ہوگا۔ کوئی ایسی ترکیب کرو کہ ہم ملک راج آنند کو یہاں سے نکال کر حلقہ میں لے چلیں۔ ابن انشا فوراً ہی ان کی طرف دوڑا۔ میرا تعارف کرایا کہ ''یہ انتظار حسین ہیں۔ حلقہ ارباب ذوق کے سیکرٹری ہیں۔ آپ کو حلقہ کے جلسہ میں شرکت کی دعوت دینا چاہتے ہیں۔''

میں نے فوراً ٹکڑا لگایا ''دیکھئے اس شہر کے نوجوان ادیبوں کو اگر آپ نوازنا چاہتے ہیں تو وہ تو اس وقت یہاں نہیں ہیں۔ وہ تو آپ کو حلقہ میں ملیں گے۔''

ملک راج آنند چلنے کے لیے فوراً تیار ہو گئے۔ ہم انہیں حلقہ میں لے کر آئے۔ جلسہ شروع ہو چکا تھا۔ جیلانی کامران صدرات کر رہے تھے۔ میں نے جوائنٹ سکیرٹری عزیز الدین احمد کی معرفت جیلانی کامران کو پیغام دیا کہ کیا یہ ہو سکتا ہے کہ تم مہمان کا استقبال کرتے ہوئے صدارت کی کرسی پر اسے بٹھا دو۔ جیلانی کامران نے صاف کہہ دیا کہ میں صدارت کی کرسی پر بیٹھ چکا ہوں۔ اب میں کسی کی خاطر اس کرسی سے نہیں اٹھوں گا۔ جیلانی کامران نے پاکستان کی روایات کے عین مطابق کیا۔ یہاں کرسی پر جو بھی بیٹھ جاتا ہے پھر اسے خدا ہی اٹھائے تو اٹھتا ہے۔ میں نے پھر وہی امریکی مہمانوں والا نسخہ استعمال کیا کہ یہاں عزت سے بٹھاؤ' باقی عزت افزائی ٹی ہاؤس میں چل کر کرو۔

ہم ایسے وقت میں جلسہ میں پہنچے تھے جب نظم پڑھی جا چکی تھی۔ اب اس پر بحث ہو رہی تھی۔ نظم کی ایک نقل ملک راج آنند کو پیش کی گئی۔ انہیں کیا خبر کہ شاعر کون ہے۔ نظم پڑھ کر گویا ہوئے کہ یہ نظم بتا رہی ہے کہ اس کا لکھنے والا بیس اکیس کی عمر کا کوئی نوجوان ہے۔

اس پر جلسہ میں ایک زبردست قہقہہ پڑا۔ یہ تبسم کاشمیری کی نظم تھی۔ اس وقت اس عزیز کی یہی عمر تھی۔ میں ملک راج آنند کی تقریر سے پہلے ہی متاثر تھا' اب اور قائل ہو گیا کہ کمال صاحب نظر ہے۔ شعر پڑھ کر شاعر کی عمر بتا دیتا ہے۔

◆◆◆

حکیم جی کا مطب ہماری بیٹھک

''مشرق'' کے دفتر کے عین سامنے کی گلی میں ایک چھوٹا سا مطب تھا جو یاروں کی بیٹھک بھی تھا۔ مگر پہلے تو مجھے خود ''مشرق'' کا ذکر کرنا چاہیے جس نے مجھے کالم نگار بنایا ورنہ صحافت تو بہت پہلے سے میرا پیشہ چلی آ رہی تھی۔ ویسے کالم نگاری کا آغاز ''آفاق'' ہی سے ہو گیا تھا' مگر وہاں میں اس حیثیت میں بدنام نہیں ہوا تھا۔ ایک تو یہ کہ اپنے نام سے نہیں لکھتا تھا' پھر کالم نے بھی کچھ ایسی شہرت حاصل نہیں کی۔

آفاق کے ذکر کے ساتھ مجھے کچھ شخصیتیں یاد آ رہی ہیں۔ سب سے پہلے پروفیسر سرور کا ذکر کرنا چاہیے جو آفاق کے دور اول میں آفاق کے ایڈیٹر تھے۔ آدمی شریف تھے۔ اور اخباروں میں جو سیاست ہوتی ہے شریف آدمی اس کا مقابلہ کم ہی کر پاتا ہے۔ سو انہیں جلدی ہی اس اخبار سے نکلنا پڑا۔ بہرحال میرا ان سے ایک رشتہ قائم ہو گیا تھا۔ ابھی میں کہہ رہا تھا کہ سرور صاحب شریف آدمی تھے' اس لیے میں نے انہیں پریشان حال ہی پایا۔ پریشاں حالی نہ ہوتی تو بھی انہیں پریشان ہی رہنا تھا۔ سرور صاحب جامعی تھے۔ اور ان کا المیہ یہ تھا کہ جامعہ ملیہ کو وہ کبھی بھول نہیں پائے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین کی بصیرت پر ایمان کامل رکھتے تھے اور ان کے کہے کو حرف آخر جانتے تھے۔ سو ان کے سوچنے کا انداز اور' اردگرد یار و اغیار کے سوچنے کا انداز اور۔ میں جب حاضر خدمت ہوتا تو کھل اٹھتے اور بس شروع ہو جاتے۔ لگتا کہ بہت دنوں سے کوئی ایسا نہیں ملا جس سے وہ اپنی جامعی فکر کے ساتھ بے تکلف بات کر سکیں۔

''آفاق'' بند ہو کر جب دوبارہ شروع ہوا تو اب اس کے ایڈیٹر مولانا غلام عباس مہر تھے اور مینجنگ ایڈیٹر میر نور احمد' یہ دونوں شخصیتیں ظاہر میں تو ایک دوسرے کی ضد تھیں' اور ہر اعتبار سے۔ میر نور احمد دبلے پتلے لمبے لگ لگ۔ مولانا غلام رسول مہر چوڑے چکلے۔ میر صاحب بات اتنی آہستہ کرتے کہ لگتا کہ بس منمنا رہے ہیں۔ مہر صاحب بات اتنے اونچے لہجہ میں کرتے کہ سارا کمرہ گونج جاتا۔ پھر میر صاحب تو پنجاب کے محکمہ تعلقات عامہ کے ڈائریکٹر رہے تھے اور پنجاب کی سیاست میں پیرے ہوئے تھے۔ مہر صاحب مرد محقق' اپنی تصنیف و تالیف کے کاموں میں غرق۔ کسی وقت میں سرگرم اخبار نویس رہے ہوں گے۔ آخر اخبار انقلاب کے واسطے سے سالک و مہر کی جوڑی بلاوجہ تو مشہور نہیں ہوئی تھی۔ مگر اب تو ان کی اخبار نویسی اور ساتھ میں ایڈیٹری بس اتنی تھی کہ آتے' اداریہ لکھتے اور فوراً ہی چلے جاتے اور کب آتے تھے اور کب جاتے تھے اس کا دفتر میں شاید ہی کسی کو پتا چلتا ہو۔

تو سیاہ و سفید کے مالک میر صاحب تھے۔ایک روز انہوں نے مجھے یاد کیا اور اطلاع دی ''انتظار صاحب'' آپ تو سرپلس ہو گئے۔''

میں کچھ نہ سمجھا۔تب انہوں نے وضاحت کی'' آپ کے ذمے تو خصوصی ایڈیشن تھا اخراجات زیادہ ہوجانے کی وجہ سے ہم اسے بند کررہے ہیں تو آپ سرپلس ہوگئے۔رکے۔پھر بولے'' مگر ہم آپ کو چھوڑنا نہیں چاہتے' یہ بتایئے اس اخبار میں آپ اور کیا کام کر سکتے ہیں۔ڈیسک پر تو آپ نہیں جانا چاہیں گے۔''

''جی نہیں۔''

پھر سوچئے' بتایئے آپ کے سپرد کون سا کام کیا جاسکتا ہے؟

مجھے اچانک خیال آیا۔''آفاق'' میں ایک مستقل کالم''افکار وحوادث'' کے عنوان سے چھپتا چلا آیا تھا جو مولانا عبدالمجید سالک لکھا کرتے تھے' مگر اب آفاق سے ان کا تعلق منقطع تھا۔چند دن یہ کالم شوکت تھانوی نے لکھا۔مگر شاید ان کی ریڈیو کی مصروفیات کے ساتھ یہ کالم چل نہیں سکا۔سو انہوں نے معذرت کرلی۔

''آپ پسند کریں تو افکار وحوادث کا کالم مجھ سے لکھوایئے۔''

میر صاحب نے تامل کیا۔پھر بولے'' آپ کو معلوم ہے یہ کالم سالک صاحب لکھا کرتے تھے؟''

''جی معلوم ہے۔''

سوچ میں پڑ گئے۔پھر بولے'' اچھا ایسا کیجئے' آپ تو مہر صاحب کے گھر قریب ہی کہیں رہتے ہیں تو ایسا کیجئے کہ صبح یہاں آنے سے پہلے کالم لکھ کر مہر صاحب کے پاس لے جایا کریں۔وہ فیصلہ کریں گے۔''

اگلی صبح کالم لکھ کر میں گھر سے نکلا اور مہر صاحب کی طرف چلا۔میں نے گیٹ میں قدم رکھا تو احساس ہوا کہ مہر صاحب زور زور سے بول رہے ہیں۔کمرے میں قدم رکھا تو کیا دیکھتا ہوں کہ مہر صاحب آنکھیں موندے اونچی آواز میں بول رہے ہیں اور قریب بیٹھے ایک بزرگ جو بعد میں پتا چلا کہ نشتر جالندھری ہیں تیزی سے لکھ رہے ہیں۔میرے قدموں کی آہٹ سن کر آنکھیں کھولیں۔مجھے دیکھ کر اشارے سے بیٹھنے کو کہا۔پھر آنکھیں موندلیں اور بولنا شروع کردیا۔

پتا چلا کہ یہ ان کا معمول ہے۔وہ بولتے ہیں اور نشتر جالندھری لکھتے ہیں۔جب ڈکٹیشن سے فارغ ہوئے تو میری طرف متوجہ ہوئے۔میں نے بتایا کہ آپ کو میرا کالم دیکھنا ہے۔

''ہاں ہاں میر صاحب نے ذکر کیا تھا' آپ کالم میرے پاس چھوڑ جائیں۔''

تین چار دن تک میں باقاعدگی سے مہر صاحب کے یہاں جاتا رہا اور یہ منظر دیکھتا رہا۔ پھر مہر صاحب نے مجھے مطلع کیا' عزیز' اب آپ کو زحمت کرنے کی ضرورت نہیں ہے' میر صاحب کو میں نے بتا دیا ہے۔''

میر صاحب سے جا کر ملا تو پتا چلا کہ مہر صاحب نے تو مجھے پاس کر دیا ہے۔ اب میر صاحب نے میری ٹریننگ شروع کی۔ ''دیکھئے یہ آپ کا ادبی کالم' محفلیں' نہیں ہے اس میں ملکی سیاست پر بات ہوتی ہے۔ تو بات ایسے کہی جانی چاہیے کہ بات بھی ہو جائے اور آپ پکڑ میں بھی نہ آئیں۔''

میر صاحب بہت رکھ رکھاؤ سے بات کرتے تھے۔ کسی فقرے کسی بیان پر اعتراض ہوتا تو کہتے ''انتظار صاحب' یہ جو آپ نے فقرہ لکھا ہے'' چپ ہو جاتے' رکتے' آں ان کرتے رہتے' پھر کہتے ''یہ فقرہ تو کھلا ڈلا بیان ہے اس پر تو اخبار کو نوٹس بھی آ سکتا ہے'' یا پھر اس قسم کی بات کہ ''انتظار صاحب' یہ دو جو فقرے آپ نے آخر میں لکھے ہیں۔'' پھر چپ' پھر جیسے بات کہنے کے لیے مناسب لفظ تلاش کر رہے ہیں ''کیا خیال ہے آپ کا' یہ فقرے زائد نہیں ہیں' بات تو آپ کی پچھلے فقرے میں مکمل ہو گئی ہے۔''

میں سمجھتا تھا کہ میر صاحب بس افسر قسم کی شخصیت ہیں۔ ریٹائر ہو کر اخبار سنبھال لیا' مگر نہیں صاحب' وہ تو زبان و بیان کی باریکیوں میں جاتے تھے' فقرہ ذرا ابودا ہو یا فالتو ہو تو فوراً انگلی رکھتے تھے۔ انہوں نے آگے چل کر جو کتاب لکھی ''مارشل لا سے مارشل لا تک'' اس میں بھی آپ یہ دیکھیں گے کہ بات نپی تلی' بیان حشو و زائد سے پاک۔

جب اخبار ڈوبنے لگا تو سہگل والوں نے اس سے اپنا دامن چھڑایا اور مشرق کے عملہ کو بخش دیا کہ اخبار اب تمہارا ہے' تم جانو' تمہارا کام جانے' حکیم محمد حسن قرشی سے معاملہ کر لیا۔ حکیم صاحب شریف النفس' مانے ہوئے حکیم' مگر شفا اب اس اخبار کی تقدیر میں نہیں تھی۔

حکیم محمد حسن قرشی تو آفاق کے دفتر میں کبھی نہیں آئے' مگر ان کے چھوٹے صاحبزادے حکیم ریاض قرشی دفتر میں آ کر بیٹھے تھے ان کی حکمت کا میں فوراً ہی قائل ہو گیا تھا۔ میں ان دنوں گردے کے مرض میں مبتلا تھا اور سخت تکلیف میں تھا۔ چار پڑیاں دے کر انہوں نے تکلیف کو تو فوراً ہی رفع کر دیا۔ پھر کہا کہ ایسی معجون بنا کر دوں گا کہ پتھری ریزہ ریزہ ہو کر نکل جائے گی۔ بس آپ دو کالے بچھو مجھے عنایت کر دیں۔''

''میں کالے بچھو آپ کے کے لیے کہاں سے لاؤں۔''

''پنجاب میں کالا بچھو نہیں ہوتا۔ سرحد میں ہوتا ہے۔ پشاور میں جو ''آفاق'' کا نمائندہ ہے اس سے کہیں۔ وہ فراہم کرے گا۔''

میں نے پشاور کے نمائندے سے بات کی۔ لیجئے دو کالے بچھو آ گئے اور حکیم ریاض نے معجون بنانی شروع کر دی' مگر وہ معجون میری تقدیر میں نہیں تھی۔ اخبار زوال کرتا چلا جا رہا تھا۔ اتنا زوال کیا کہ میں اس کا ایڈیٹر بن گیا' مگر اس کے فوراً بعد ایسے حالات پیدا ہوئے کہ میں نے مختصراً استعفیٰ لکھا اور گھر بیٹھ رہا۔ پھر حکیم ریاض سے فون پر بات ہوئی۔ کہہ رہے تھے کہ ''ایک مرتبہ دفتر تو آئیں۔ وہ معجون آپ کا انتظار کر رہی ہے۔'' میں نے کہا کہ وہ معجون آپ کسی دوسرے مریض کو چٹائیں۔''

''مگر کالے بچھو تو آپ نے دیئے تھے۔''

''وہ کالے بچھو میں نے آپ کو بخشے۔ آپ مجھے بخش دیجئے۔''

لو بات میری کالم نگاری سے چلی تھی اور بچھوؤں تک پہنچی۔ کالم نگاری کا واقعی بکھیڑا مشرق سے شروع ہوا۔ میں اسی گمان میں تھا کہ مروجہ صحافتی روایت کے مطابق کوئی اچھا سا قلمی نام رکھوں گا اور کالم لکھا کروں گا۔ ''مشرق'' کے بانی اور مینجنگ ایڈیٹر عنایت اللہ صاحب نے کہا ''جی نہیں' کالم آپ کے نام سے چھپے گا اور ساتھ ہی آپ کی تصویر بھی چھپا کرے گی۔''

میں نے انہیں اردو صحافت کی روایت کا احساس دلانے کی کوشش کی اور صحافت میں قلمی نام کی معنویت پر روشنی ڈالی مگر وہ ٹس سے مس نہیں ہوئے۔

شام کو ناصر سے ملاقات ہوئی تو میں نے اسے بتایا کہ مشرق سے میرا معاملہ طے ہو گیا' مگر انہوں نے عجب شرط رکھی ہے کہ کالم نام سے چھپے گا اور ساتھ میں تصویر بھی چھپا کرے گی۔

''بس پھر تم دوسرے احسان بی اے بن جاؤ گے۔ ادب سے تو گئے۔''

میرا منہ پہلے ہی لٹکا ہوا تھا۔ اب اور لٹک گیا۔ ناصر نے میری کیفیت دیکھی تو دھیرے دھیرے پینترا بدلا۔ سمجھانے لگا کہ لکھنے والوں کی زندگی میں ایسے فرمائشی مرحلے بھی آتے ہیں جب انہیں اور قسم کا کام کرنا پڑتا ہے اور خطرہ ہوتا ہے کہ ان کا اصل کام اور نام اس کام کے نیچے دب جائے گا۔ اصل امتحان ادیب کا ایسے ہی وقت میں ہوتا ہے۔ تمہارے لیے بھی یہ امتحان ہے کہ تم اپنے افسانہ نگار کی شناخت کو کالم نگاری سے الگ کس طرح برقرار رکھتے ہو۔

اب چونکہ مجھے اپنے اصل نام سے کالم لکھنا تھا اس لیے اپنے حال پر غور کر کے ایک فیصلہ کرنا لازم آیا کہ استاد تینوں کھونٹ جانا۔ چوتھے کھونٹ میں کبھی قدم مت رکھنا' مبادا تم انسان سے حیوان بن جاؤ' بندر یا سور یا ہرن۔ پاکستانی سیاست میرے لیے چوتھا کھونٹ

ٹھہری۔اب اگر اس کوچے سے کوئی مخلوق نکل کر میرے پالے میں آ جائے یعنی اولوالعزم ادیبوں کی تصانیف کا افتتاح کرتے ہوئے اپنے سپیچ رائٹروں کی مدد سے ادیبوں کو سمجھانے لگے کہ انہیں کیسا ادب لکھنا چاہیے تو پھر تو مجبوری ہے۔ایسے بھاشن سے تو کما حقہ انصاف کرنا ہی ہوگا۔باقی خود ان کے کوچے میں کبھی مت جاؤ۔

اس فیصلہ کی افادیت کا احساس مجھے اس وقت ہوا جب ''مشرق'' پریس ٹرسٹ کے سایہ عاطفت میں چلا گیا۔جنرل ضیاء الحق کے زمانے میں پہنچتے پہنچتے عجب صورت حال پیدا ہوئی۔ان کے مقرر کردہ محبوب ایڈیٹر ضیاء السلام انصاری نے سوچا کہ ''مشرق'' میں ایسا کالم بھی تو ہونا چاہیے جس میں اس مرد آہن کے کارنامے بیان کیے جائیں۔یہ کام انہوں نے اپنے ذمے لیا اور ایسا کالم لکھنا شروع کیا جو روز صفحہ اول پر شائع ہوتا۔اب مشرق کا اصلی تے وڈا کالم یہ تھا اور یہیں سے مشرق نے پنگی کھائی اور ڈوبتا چلا گیا۔

''مشرق'' کی ابتدا کیا تھی اور انتہا کیا ہوئی۔اس اخبار کی تقریب سے اردو صحافت میں شاید پہلی مرتبہ عورت کا قدم آیا۔خواتین کا صفحہ شروع ہوا جس کے متعلق کہا گیا کہ اسے مرد بھی پڑھ سکتے ہیں۔''بھی'' کیا معنی مسرت جبیں کا کالم تو مردوں ہی میں زیادہ مقبول تھا۔عورتوں کے معاملات کچھ اس طرح یہاں زیر بحث آئے کہ مشرق نے باورچی خانے سے لے کر گرلز کالج تک میں مقبولیت پائی۔ریاض بٹالوی نے جس فیچر نگاری کی طرح ڈالی اس کا خلاصہ یوں کیا جا سکتا ہے کہ

بدل کر فقیروں کا ہم بھیس غالب
تماشائے اہل کرم دیکھتے ہیں

فقیروں کے بھیس پر موقوف نہیں۔ایک مرتبہ مریض کا بھیس بھرا اور ہسپتال میں داخل ہو گئے۔وہاں جو ڈاکٹروں کا احوال دیکھا وہ وہاں سے نکل کر اپنے فیچر میں بیان کیا۔اے لو ڈاکٹر بگڑ گئے۔مشرق کے دفتر پر ہلہ بول دیا۔ایک دفعہ اپنے گم ہو جانے کا شگوفہ چھوڑا۔بھیس بدل بدل کر کبھی اس تھانے میں۔مقصود یہ تھا کہ تھانوں کا احوال معلوم کیا جائے اور فیچر میں اسے بیان کیا جائے۔

کیا خوب اخبار تھا۔جب حکومت کے خلاف تحریک چلتی تھی تو اس کے دفتر پر اینٹیں برستی تھیں۔جب تحریک کا زمانہ گزر جاتا تو پھر داد کے ڈونگرے برستے تھے۔اشاعت جو گر جاتی تھی پھر بحال ہو جاتی۔

اچھا میرے کالم کے بارے میں ڈیڑھ بات سن لیجئے۔عنایت اللہ صاحب نے مجھے ایک نوٹس اور دیا تھا' دیکھئے آپ کا کالم ادبی حلقوں میں پڑھا جاتا ہے یا نہیں' اس سے ہمیں کوئی غرض نہیں' ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ ''مشرق'' کا یہ کالم بھاٹی دروازے کے تھڑوں پر پڑھا جانا چاہیے۔''

اس قسم کا کالم کیسے لکھ پاؤں گا' سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ قلم ہر پھر کر کسی ادبی یا تہذیبی مسئلہ کی طرف مڑ جاتا اور روز طعنہ ملتا کہ بھاٹی دروازے کے دکانداروں کو تو پتا ہی نہیں چل رہا کہ مشرق میں کوئی کالم لاہور نامہ کے عنوان سے بھی چھپتا ہے۔ اس مشکل صورت حال سے فلمی اداکارہ نیلو نے مجھے نجات دلائی۔ افواہ اڑی کہ نیلو شادی کر رہی ہے۔ نیلو نے لارڈز میں ایک پریس کانفرنس کر ڈالی۔ میں اپنی چائے کی میز سے اٹھا اور پریس کانفرنس میں جا بیٹھا۔ نیلو اپنی اینگلو انڈین قسم کی اردو میں اپنی صفائی پیش کر رہی تھی کہ دوسری شادی کی اس کی کوئی نیت نہیں ہے۔ میں نے نیلو کے اس منفرد طرز بیان کو احتیاط سے گرہ میں باندھا اور اپنے کالم میں پرو دیا۔

دوسرے دن جب میں دفتر پہنچا تو عنایت صاحب جیسے میرے انتظار میں بیٹھے تھے۔ فوراً دبوچ لیا۔ کہا کہ ''آپ پر جرمانہ ہو گیا' دس روپے دیجئے' مٹھائی آئے گی۔''

میں ہکا بکا۔ کیسا جرمانہ' مٹھائی کس خوشی میں۔ جب مٹھائی آ گئی تو عنایت صاحب نے اعلان کیا کہ لاہور نامہ آج بھاٹی دروازے کے تھڑوں میں پہنچ گیا۔ انتظار صاحب کالم نگار پکے ہو گئے۔

بھاٹی دروازے کے دکاندار سمجھدار نکلے کہ اس کالم کو کالم سمجھ کر ہی پڑھا۔ گرلز کالجوں کی استانیوں اور لڑکیوں سے مجھے داد یوں ملی جیسے میں ادبی شہ پارے لکھ رہا ہوں۔ جب بھی کسی ان کی تقریب میں جانا ہوا میں نے صفائی پیش کی کہ یہ ادب نہیں صحافت ہے۔ اب اگر آگے چل کر یاروں نے کالم نگاری کو ایک ادبی صنف قرار دے دیا تو یہ ان کا اپنا کارنامہ ہے۔

''مشرق'' نے بعد میں تو خیر اپنی شاندار عمارت کھڑی کر لی اور پھر یہی عمارت اس کا مدفن بنی۔ مگر جن دنوں مشرق سچ مچ ایک اخبار تھا' ان دنوں نسبت روڈ پر کرائے کی ایک مختصر عمارت میں شاد آباد تھا' جہاں جگہ تنگ ہونے کی وجہ سے ہم کھچ پچ ہو کے بیٹھتے تھے۔ اسی دفتر کے عین سامنے ایک پتلی گلی تھی جہاں ایک چھوٹا سا مطب تھا کہ مطب بھی تھا اور یاروں کی بیٹھک بھی۔

یہ حکیم حبیب اشعر کا مطب تھا۔ ''مشرق'' کے دفتر میں کسی کو بھول چوک میں چھینک بھی آ جاتی تو دوڑا ہوا مطب جاتا اور چائے پی کر اور دوا لے کر واپس آتا۔ چھینک نہ بھی آتی بس خبروں سے نبٹتے ہوئے طبیعت بور ہو جاتی تو قلم رکھا اور سیدھا مطب کی طرف۔ حکیم صاحب کی جمنا میں دھلی ہوئی اردو سنی' چائے پی اور ہشاش بشاش واپس آ کر پھر کام میں جت گئے۔ میرا وقت ''مشرق'' کے دفتر میں کم اور مطب میں زیادہ گزرتا۔ مطب میں یاروں اور بیماروں کا ایک ہجوم رہتا تھا۔ بیمار تو آٹے میں نمک ہی کی نسبت سے ہوتے تھے۔ مگر یاروں میں اتنے گڈمڈ ہو جاتے کہ ان کی الگ شناخت مشکل ہو جاتی۔ یا وہ بیمار تھے جو شفایاب ہو چکے تھے' مگر اب یہ بھول گئے تھے کہ وہ یہاں بیمار کی حیثیت سے آئے تھے۔ جو نیا مریض آتا وہ سخت پریشان ہوتا کہ یہاں تو حالات حاضرہ پہ بحث ہو

رہی ہے' وہ حکیم صاحب کو نبض کیسے دکھائے اور حال اپنا کیسے سنائے۔ چند دنوں میں وہ اس فضا سے مانوس ہو جاتا۔ آتے ہی بحث میں کود پڑتا' چائے پیتا' دیر بعد اسے یاد آتا کہ اسے حکیم صاحب کو اپنا حال بتانا ہے اور نئی دوا لینی ہے۔

حکیم صاحب مریض کو چار دن مریض سمجھتے۔ پانچویں دن وہ ان کا یار عزیز ہوتا۔ پھر دوا کی قیمت لینی بند کر دیتے۔ سارا علاج مفت۔ چائے کی دور مستزاد۔ بھلا ایسے مطب چلا کرتے ہیں۔ سو حکیم حبیب اشعر کو میں نے آسودہ حال کبھی نہیں دیکھا۔ مگر مالی حالات جو بھی ہوں مجال ہے کہ وضع میں فرق آ جائے اور یاروں کو خمیروں جوارشوں سے نوازنے میں کوئی کمی آ جائے۔ وقتاً فوقتاً علماء و محققین بھی اس مطب میں آتے جاتے دیکھے جاتے تھے۔ آخر اس شعبہ سے بھی تو حکیم صاحب کا ایک رشتہ چلا آتا تھا۔ غالب کے جشن سو سالہ کا جب چرچا ہوا تو اس تقریب سے بعض محققین کو میں نے اس مطب کے پھیرے لگاتے دیکھا۔ پروفیسر وزیر الحسن عابدی جب یہاں پہلی مرتبہ نمودار ہوئے تو میں سمجھا تھا کہ طبیعت ناساز ہوگی' دوا لینے آئے ہیں مگر پھر میں نے یہ نقشہ دیکھا کہ روز صبح وارد ہوتے ہیں۔ اعلان تاشقند' ایوب خان' اسلامی سوشلزم' شیخ مجیب الرحمن کے چھ نکات' موضوع کوئی بھی ہوتا' بحث کتنی بھی گرم ہوتی' عابدی صاحب بے تعلق گم متھان بیٹھے ہیں۔ موقع ملنے پر اشعر صاحب سے کھسر پھسر کرتے اور چلے جاتے۔ مجھے کرید ہوئی کہ عابدی صاحب کیا لینے آتے ہیں۔ نبض تو دکھاتے نہیں نہ دوا لے کر جاتے ہیں۔ میں نے اشعر صاحب سے پوچھا۔ پتا چلا کہ انہیں کہیں سے سن گن ملی ہے کہ غالب کا کوئی مخطوطہ اس شہر میں کسی دلی والے کے پاس موجود ہے۔ اب گلی محلوں میں اس دلی والے کو ڈھونڈتے پھرتے ہیں۔ اشعر صاحب سے اس شہر میں آ کر آباد ہونے والے اہل دلی کا اتا پتا معلوم کرتے ہیں اور پھر ان کے کھوج میں نکل جاتے ہیں اور ہاں اس کھوج کے بیچ انہوں نے لگے ہاتھوں غالب کی ٹوپی پر بھی تحقیق کر ڈالی۔

عابدی صاحب تحقیق کے مراحل سے ساری کٹھنائیوں کے باوصف آسان گزر گئے۔ مشکل انہیں اس وقت پیش آئی جب انہیں بحالت روزہ غالب پر گفتگو کرنی پڑی۔ غالب صدی کی تقاریب رمضان کے عین بیچ شروع ہوئیں۔ ایک تقریب میں میں نے دیکھا کہ عابدی صاحب غالب پر تقریر کر رہے ہیں۔ بیچ بیچ میں مختلف شعروں کے مضمون کا حوالہ دیتے ہیں مگر شعر نہیں پڑھتے۔ کیا انہیں غالب کے شعر یاد نہیں تھے۔ نہیں' آخر انہوں نے معذرت کی اور کہا کہ افسوس ہے کہ میں اس وقت غالب کے شعر پیش کرنے سے قاصر ہوں۔ وجہ یہ ہے کہ میں روزے سے ہوں۔

یاروں کو یہ عذر عجب لگا۔ بہر حال میں نے بوجھ لیا۔ مجھے اپنے والد صاحب یاد آ گئے جو رمضان میں شاعری سے گریز کرتے تھے۔ کہا کرتے تھے کہ روزے میں شعر پڑھا جائے تو روزہ مکروہ ہو جاتا ہے۔ وجہ یہ بتاتے تھے کہ شعر میں مبالغہ ہوتا ہے اور مبالغہ

بھی بمنزلہ جھوٹ کے ہے۔

عابدی صاحب دین دار پرہیز گار آدمی' ساتھ میں رند شاہد باز غالب کے پرستار۔ مگر کیا توازن قائم کیا تھا کہ نہ اپنی دینداری' پرہیز گاری پہ آنچ آنے دی نہ غالب پر تحقیق میں کوتاہی کی۔

غالب کے سو سالہ جشن کا حوالہ آیا ہے تو مجھے پروفیسر حمید احمد خاں یاد آ رہے ہیں۔ کیا خوب بزرگ تھے۔ وقت کے ایسے پابند کہ جو وقت مقرر ہے اس پر آئیں گے اور اس سے ایک منٹ پہلے نہ ایک منٹ بعد۔ تقریب میں صدارت کرنے یا مقالہ پڑھنے کے لیے مدعو ہوتے تو منتظمین کے لیے مسئلہ بن جاتے۔ باون تولے پاؤ رتی صحیح وقت پر ہال میں قدم رکھتے۔ بیٹھتے ہی گھڑی دیکھتے۔ جلسہ شروع ہونے میں ایک ڈیڑھ منٹ کی بھی تاخیر ہوتی تو واپس جانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے۔ حلقہ ارباب ذوق کے ایک ہفتہ وار جلسہ میں صدارت ے لیے مدعو تھے۔ ٹھیک چار بجے جو جلسہ کا اعلان کردہ وقت تھا بورڈ روم میں داخل ہوئے۔ بورڈ روم خالی تھا۔ جوائنٹ سیکرٹری صاحب کرسیاں درست کر رہے تھے' میز کی صفائی کر رہے تھے۔ خاں صاحب نے خالی کرسیوں پر نظر ڈالی۔ برہمی سے بولے ''جلسہ کا وقت تو ہو گیا ہے اور یہاں کوئی بھی نہیں ہے۔'' جوائنٹ سیکرٹری نے ان سے اجازت لی۔ دوڑا ہوا ٹی ہاؤس گیا اور قیوم نظر کو ان کی آمد کی اطلاع دی۔ چائے پیتے ادیبوں میں کھلبلی پڑ گئی۔ قیوم صاحب سرپٹ دوڑے اور ہانپتے ہانپتے بورڈ روم میں داخل ہوئے۔ خاں صاحب نے کلائی پر بندھی گھڑی پر نظر ڈالی' خشمگیں نظروں سے قیوم نظر کو دیکھا۔ بولے ''قیوم صاحب' اب چار بج کر تین منٹ ہو رہے ہیں۔ یہاں جلسہ شروع ہونے کے کوئی آثار نہیں ہیں۔ مجھے اجازت دیجیے۔''

قیوم صاحب نے تھوتھمبو کر کے انہیں صدارت کی کرسی پر بٹھایا۔ جلسہ فوراً ہی شروع کر دیا۔ حاضرین بعد میں آتے رہے۔

خاں صاحب سخت اصول پرست۔ ضابطہ سے ذرا سا انحراف بھی برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ زود حسی اس پر مستزاد۔ مزاج کے خلاف ذرا کوئی بات ہو جائے بکھر جاتے تھے۔ پاکستان کے محب ایسے کہ پاکستان کے حالات پر کوئی تنقید کر دے تو اسے پاکستان دشمنی پر محمول کرتے تھے۔ میں نے حلقہ میں اپنا افسانہ بن لکھی رزمیہ' انہی کی صدارت میں پڑھا تھا۔ سن کر ایسے برہم ہوئے کہ افسانے کی ہندی کی چندی کر دی۔ بعد میں ایک دوست سے پوچھا کہ یہ نوجوان انتظار حسین کیا کمیونسٹ ہے۔ اس نے کہا کہ اینٹی کیونسٹ ہے' مگر انہوں نے اس بیان پر اعتبار نہیں کیا۔

پھر میرا ایک کالم ان کی ناراضگی کا سبب بنا۔ انہی دنوں لندن سے واپس آئے تھے۔ حلقہ میں ایک مقالہ پڑھا جس میں ''بانگ درا'' کی بعض نظموں پر بحث تھی۔ بتایا تھا کہ کون سی نظم انگلستان کے کس شاعر سے ماخوذ ہے۔ میں ''آفاق'' میں کالم لکھا کرتا تھا۔

ڈرتے ڈرتے لکھا کہ یہ تحقیق تو لاہور میں بیٹھ کر بھی ہو سکتی تھی۔ لندن جانا کیا ضرور تھا۔

یہ کالم شاید آیا گیا ہو جاتا' مگر ہوا یوں کہ حسرت صاحب کی نظروں سے کہیں یہ کالم گزرا۔ حسرت صاحب پہلے ہی کتنے ترقی پسند شاعروں سے محض اس بنا پر کدر کھتے تھے کہ وہ اقبال کا خاطر خواہ احترام نہیں کرتے تھے۔ انہوں نے حمید احمد خاں پر بھی طنز و تعریض کر ڈالی۔ اس پر لے دے شروع ہو گئی۔ ''چٹان'' میں کہیں یہ فقرہ لکھا گیا کہ مولانا کو دیکھو بزرگ ہو کر ایک لڑکے کے بھرے میں آ گئے اور پروفیسر حمید احمد خاں کے خلاف کالم باندھ دیا۔ یہ فقرہ حسرت صاحب پر بھاری پڑا۔ اس شام ان کا تانگہ کافی ہاؤس جاتے جاتے ٹی ہاؤس کی طرف مڑا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ حسرت صاحب ٹی ہاؤس میں داخل ہوئے ہیں۔ دروازے ہی سے رعب دار آواز میں مجھے پکارا ''مولانا ذرا یہاں آیئے۔''

میں دوڑ کر پہنچا۔ مولانا غصے میں تھے۔

''مولانا' میں یہ کیا سن رہا ہوں۔ شورش کہتا ہے کہ میں نے تمہارے کالم سے متاثر ہو کر حمید احمد خاں کے خلاف کالم لکھا ہے۔''

میں نے شورش کاشمیری کے خلاف جو کہہ سکتا تھا کہہ ڈالا۔ مولانا خوش ہو گئے۔ پھر میں کافی ہاؤس تک ان کے ساتھ گیا۔ ہاں ''آفاق'' دوبارہ انہی دنوں شروع ہوا تھا۔ اب مولانا غلام رسول مہر اس کے ایڈیٹر تھے اور میر نور احمد مینجنگ ایڈیٹر۔ میں نے باتوں باتوں میں پوچھا ''مولانا' یہ سنا جا رہا ہے کہ آپ ''آفاق'' میں آ رہے ہیں۔''

پھر برہم ہو گئے۔ ''مولانا کیا کہہ رہے ہیں آپ۔ وہ جو غلام رسول ہے' میں اس کے ساتھ کام کروں گا اور وہ نور احمد' اسے صحافت کا کیا پتا۔''

خیر ذکر حمید احمد خاں صاحب کا تھا۔ انہیں اب مجھ سے ناراض ہونا ہی تھا۔ آفتاب احمد خاں نے مجھے بہت شرم دلائی کہ تمہیں خاں صاحب کے علمی مرتبے کا احساس نہیں۔ اور پھر وہ ہمارے بزرگ ہیں۔ تم نے انہیں ناراض کر دیا۔ ان کے ساتھ جا کر میں نے ان کی خدمت میں مناسب لفظوں میں معذرت بھی کر لی۔ وقتی طور پر شاید تھوڑا نرم بھی پڑ گئے تھے' مگر دل میں جو گرہ پڑ گئی تھی وہ نہیں نکلی۔ جب بھی کسی محفل میں مڈھ بھیڑ ہوئی یہی دیکھا کہ تیوری چڑھی ہوئی ہے۔ بات کی تو روکھے پن سے۔ آدمی کم دماغ تھے۔ میں نے بھی ان سے دور دور رہنے ہی میں عافیت جانی۔

پھر جب خوش ہونے پر آئے تو ایسے خوش ہوئے کہ حلقہ کے جلسہ سے شروع ہوئے اور پھر ٹی ہاؤس میں چائے کی میز تک مجھے شاباسی دیتے چلے گئے۔ بس ایک مضمون سے میں نے ان کا دل جیت لیا۔ یوم میراجی کا جلسہ تھا۔ خاں صاحب صدارت کر رہے